

قومی کتب خانہ نیا بازار راولپنڈی

دار و رسن

باقی صدیقی

قومی کتب خانہ چوک نیا بازار راولپنڈی

بار اوّل :- ایک ہزار
پبلشر :- حکیم عبدالغنی قومی کتب خانہ راولپنڈی

قیمت

(دو روپیہ)

۲/۸

عمریست کہ افسانۂ منصور کہن شد

من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

ترتیب

نظمیں

۱

غلامی سے آزادی تک

ٹھوکریں کھاتے ہوئے غم کے بیابانوں میں
زندگانی کا سکوں نذرِ زمانہ کر کے
چند ڈاکو مری جنّت میں چلے آئے تھے
چُور فاقوں سے، تجارت کا بہانہ کر کے

چونک چونک اُٹھتی تھیں ہر گام پہ وحشی نظریں
حرص آلود خیالات میں بہہ جاتے تھے
دیکھ کر بادۂ انگور کے ٹھنڈے چشمے
اپنے ہونٹوں پہ زباں پھیر کے رہ جاتے تھے

حُسنِ نوخیز کی مانند اثر کرتا تھا
گنگناتے ہوئے دریاؤں کا پانی دل پر
یاد جب آتی تھیں ویران زمینیں اپنی
تیر برساتی تھی کھیتوں کی جوانی دل پر

مرغزاروں کی بہاروں سے نگاہیں ہٹ کر
جم کے رہ جاتی تھیں بلّوری دیواروں پر
لعل و گوہر کی چمک دل میں کھُبی جاتی تھی
رقص کرتی تھی ہوس آتشیں رُخساروں پر

عقل نے خُفتہ مقدر کے ہلائے شانے
دل میں ارمان اُبھر آئے نظر للچائی
دیکھتے دیکھتے اندازِ محبت بدلا
مُلک گیری کی ہوس لینے لگی انگڑائی

ڈال کر سادہ خیالوں پہ ہوس کا پرتو
ہر ادا بھانپ لی، ہر دل کو نظر میں تولا
کوئی سمجھا نہ کشاکش میں خرد کی چالیں
ایک کو ساتھ لیا، ایک پہ دھاوا بولا

ظلم و ادبار کے طوفانوں نے آنکھیں کھولیں
چین سے سوئے ہوئے ذروں کی نبضیں دھڑکیں
لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں شرارے ناچے
کیف آلود فضاؤں میں کمانیں کڑکیں

چند بکھری ہوئی موجوں کا تقاضا ہی کیا
ولولے دب گئے سینوں میں، ارادے مرجھائے
مادرِ ہند کے ماتھے پہ پسینہ آیا
ہر طرف قلعوں پہ جب اجنبی پرچم لہرائے

۱۸۵۷ء

شیر جنگل کے اور آداب غلامی توبہ
راس آئی نہ حقائق کو خیال آرائی
جب پڑا ذہنوں پہ آئینۂ حالات کا عکس
آرزو جاگ اُٹھی، احساس نے لی انگڑائی

اپنی سوئی ہوئی قسمت کا سہارا لے کر
سرفروشانہ اُمیدوں کے بگولے لہرائے
زخم کھائے ہوئے ناموسِ وطن کی خاطر
تیغوں سے تیغیں لڑیں، نیزوں سے نیزے ٹکرائے

اک بگولے کی بیاباں میں حقیقت ہی کیا
زندگی موت کی آغوش میں لہرا نہ سکی
رہ گئے سینوں ہی سینوں میں تڑپ کر جذبے
صبح کی روشنی اُبھری تھی مگر چھا نہ سکی

دیکھ کر وقت کے تیور ستم ایجادوں نے
جیل تو جیل تھے، راہوں میں صلیبیں گاڑیں
پیچ کھاتے ہوئے جسموں پہ تبر برسائے
کُند نیزوں سے دھڑکتی ہوئی نبضیں پھاڑیں

"مسندِ عدل" پہ جب ناز سے ڈاکو بیٹھے
جھوم کر نشے میں تقدیروں سے تقدیریں ملیں
جان پر کھیلنے والوں نے سزائیں پائیں
اور غداروں کو منصب ملے، جاگیریں ملیں

۱۸۵۷ء کے بعد

ظُلم کی موج تھمی، عقل نے مُہرے بدلے
مُسکراتی ہُوئی رُوحوں کا سکوں بِکنے لگا
اہلِ دولت کے لئے چند کھلونوں کے عوض
اجنبی دیس میں دہقانوں کا خُوں بِکنے لگا

کروٹیں حرص کی ہر گام پہ توبہ توبہ
چُن لی پلکوں سے چمک زر کی جہاں بھی پائی
شوق کے پردے میں ہر چیز کی کایا پلٹی
کانچ کے ٹکڑوں نے ہیروں کی جگہ اپنائی

زر نے محدود نوالوں پہ جھپٹے مارے
چور بازار بنے، بھوک نے پر پھیلائے
دیکھتے دیکھتے پُر نور گلی کوچوں پر
لہلہانے لگے افلاس کے کالے سائے

نالے لہرائے کئی، دل کئی ٹوٹے، لیکن
غمزدہ رُوحوں نے ہستی کا نہ مقصد پایا
ہر نئی بات نئے سانچے میں ڈھل کر نکلی
ہر نیا سال نئے مرحلے لے کر آیا

بمبئی میں نیوی کی جنگ

دم گھٹے جاتے تھے غربت کے دھوئیں میں لیکن
کوئی سنتا نہ تھا مظلوموں کی فریادوں کو
تلخیاں زیست کی جب ضبط کی حد سے گزریں
شور ساحل سے اٹھا مار دو جلادوں کو

بحر کے آئنہ خانوں سے قضا نے جھانکا
کج اداؤں کے جگر بن کے پسینہ ٹپکے
دیکھتے دیکھتے نعروں میں ڈھلیں فریادیں
پانی سے شعلے اٹھے، موجوں سے گولے لپکے

راس آئی نہ زمانے کو کشاکش لیکن
حلقے مضبوط ہوئے اور بھی زنجیروں کے
بیٹھ کر جام کے سائے میں جہاں بانوں نے
فیصلے کر دیئے مظلوموں کی تقدیروں کے

زیست کے دھوکے میں حالات کے دیوانوں نے
موت کے قدموں پہ سر رکھ دیئے، جانیں رکھ دیں
دام میں شیروں کو لا کر ستم ایجادوں نے
تلملاتی ہوئی نبضوں پہ سنانیں رکھ دیں

۱۵ ر اگست ۴۷ء

جب کیا وقت نے مجبور تو صیّادوں نے
ایسے انداز سے دروازے قفس کے کھولے
بڑھ کے احباب نے احباب کی راہیں روکیں
اُٹھ کے ہمسایوں نے ہمسایوں پہ خنجر تولے

باغ میں آگ لگی ایسی کہ ہر ڈالی نے
اپنے ہی پھول چُنے، اپنی ہی کلیاں نوچیں
بیٹھ کر بغض و عداوت کے گھنے سائے میں
خلق نے اپنے ہی نقصان کی باتیں سوچیں

کتنی ہنستی ہوئی نظروں کی خوشی کو رُندا
کتنی بے لوث اُمیدوں کے سہارے چھینے
کتنی مہکی ہوئی زُلفوں کی جوانی ٹوٹی
کتنے گاتے ہوئے ہونٹوں کے شرارے چھینے

کتنے آباد گھرانوں پہ ہلاکت جھومی
کتنے انوار بھرے محلوں پہ شعلے چھائے
کتنے شاداب کناروں پہ تلاطم ناچے
کتنے معصوم سفینوں پہ بھنور لہرائے

کتنے اُبھرے ہوئے شانوں کو قضا نے چوما
کتنی پیشانیوں سے خون کے دھارے پھوٹے
کتنے بیباک ارادوں کے کنول مرجھائے
کتنے بل کھاتے ہوئے سینوں میں خنجر ٹوٹے

باغ تقسیم ہوا، پھولوں نے تختے بدلے
خون پانی کی طرح بہنے لگا راہوں میں
شعلے بن بن کے ضمیروں کی سیاہی لپکی
"چھپ کے ہنسنے لگے صیاد کمیں گاہوں میں"

۱۹۴۷ء

کھنچاؤ

لوٹ کر جانے کا اے دوست ابھی وقت نہیں
بربریت کی وہ رَو تھم تو گئی ہے لیکن
بُو تعصب کی خیالوں میں ابھی ہے موجود
رنگ لائے نہ کہیں اور ہوس کی لغزش
خونِ انساں کے چھلکتے ہوئے ساغر پی کر
اس بہکتی ہوئی دُنیا کو سنبھل جانے دے

سطحِ دریا کی خموشی پہ نہ دھوکا کھانا
دل نہنگوں کے ابھی پوری طرح صاف نہیں

ابھی اُترا نہیں تفریق پرستوں کا بُخار
خُون پینے کے لئے خام سیاست کے فقیر
چھوٹوں میں سلئے مکروہ ضمیروں کے اُبال
موج در موج سفینوں پہ نظر رکھتے ہیں
اِن بلاؤں کو خدا کے لئے ٹل جانے دے

ظُلم کی اُٹھتی ہُوئی موج کو حیرت سے نہ دیکھ
شمع کی آخری لَو تیز ہُوا کرتی ہے

۱۹۴۷ء

ساقی نامہ

وہ اُٹھی ہوس کی گھٹا ساقیا — زمانے کی بدلی ہوا ساقیا
خرد عشق پر مُسکرانے لگی — خیالوں پہ تفریق چھانے لگی
عداوت کے گیسو بکھرنے لگے — مصائب کے چہرے نکھرنے لگے
روایات کروٹ بدلنے لگیں — تعصب کی موجیں مچلنے لگیں
فضا بُوئے خُوں سے مہکنے لگی — دماغوں سے وحشت چھلکنے لگی

ہوس میں جہاں کھو گیا ساقیا
زمانے کو کیا ہو گیا ساقیا

یہی ہے وہ کیا زندگی کی بہار — ہمیں جس کا صدیوں سے تھا انتظار
کہاں ہے محبت کی وہ کائنات — کہاں ہے وہ دلکش نظامِ حیات

کہاں ہیں وہ دلداریوں کے فسانے — کہاں ہیں وہ اخلاص و عجز و نیاز
نہ دے میرے دل کو فریبِ یقیں — تری مے نہیں ہے مئے انگبیں
ترے ذہن پر ہے تعصب کی گرد — ترا دل بھی مُردہ، ترا خُوں بھی سرد
نہیں ہے ترے دل پہ کیا آشکار — کہ آئی ہے کیسے یہ خُونی بہار
تجھے یاد ہوگا وہ دُنیا کا رنگ — وہ نیلے کے ساحل پہ نیوی کی جنگ
وہ بڑھتا ہوا روشنی کا قدم — وہ کُھلتا ہوا تیرگی کا بھرم
وہ اُبھری ہُوئی زندگی کی اُمنگ — وہ اُترا ہوا کج کلاہوں کا رنگ
خرد چُپ، خیالات حیران تھے — سیاست کے ہتھیار بے جان تھے
شعاعیں اُمیدوں کی روپوش تھیں — تدابیر ذہنوں میں خاموش تھیں
غمِ دہر کی سانس رُکنے کو تھی — خرد عشق کے آگے جُھکنے کو تھی
بدلنے کو تھی گردشِ صبح و شام — بدلنے کو تھا زندگی کا نظام
مگر زیست کھُل کر نہ لہرا سکی — حقیقت جہاں کو نہ راس آسکی
بڑھی تشنگی جب تو جام آگئے — پُرانے وفادار کام آگئے
خرد نے خرد کا گریباں سیا — ہوس نے ہوس کا سہارا لیا

خیالات پر عکسِ زر ڈال کر　　اُبھرتے ہوئے سیل کو ٹال کر
دکھائی نئی راہ احساس کو　　خیالوں میں اُلجھا دیا آس کو

اُٹھا کر قدم زلزلہ رُک گیا
خرد کو تھا جھکنا، جنوں جھک گیا

بغاوت کی رَو تھم گئی ساقیا　　نئی بزم اِک جم گئی ساقیا
ہوس در ہوس زیست ڈھلنے لگی　　نئی شاہراہوں پہ چلنے لگی
عداوت خیالوں میں پالی گئی　　حقیقت فسانوں میں ڈھالی گئی
خرد نے بدل کر رُخِ واقعات　　اُلٹ دی بساطِ سکونِ حیات
تنفّر کی امواج میں گھیر کر　　محبت کے ساحل سے رُخ پھیر کر
سفینے کناروں سے ٹکرا دیئے　　ستارے ستاروں سے ٹکرا دیئے

قضا کس کی تھی، کس طرف ٹال دی
کہاں کی بَلا، کس کے سر ڈال دی

نہ اوہام کے جال بُن ساقیا　　زمانے کی آواز سُن ساقیا
ہویدا ہے کیا گرم آہوں سے دیکھ　　زمانے کو میری نگاہوں سے دیکھ

وہی غم، وہی دام و صیاد ہیں — کہیں کس طرح ہم کہ آزاد ہیں
ابھی حرص کا جام پھوٹا نہیں — طلسمِ روایات ٹوٹا نہیں
ابھی زیست پر کیف چھایا نہیں — غریبوں کے گھر نور آیا نہیں
ابھی ظلم کا نام تقدیر ہے — جہاں زرپرستوں کی جاگیر ہے
یہ احساسِ وحشت، یہ جامِ شکیب — سسکتے دلوں کو نہ دے اب فریب
روایات سے کام چلتے نہیں — کھلونوں سے اب دل بہلتے نہیں
کھنکنے کو ہیں پھر غموں کے ایاغ — دھواں دے رہے ہیں دلوں کے چراغ

کدھر ہے زمانہ، کہاں ہے سماج
جہاں چاہتا ہے غموں کا علاج

۱۹۴۷ء

بھکارن

غمِ جہاں کی کروٹیں لئے ہُوئے نگاہ میں
کھڑی ہُوئی ہے زندگی سوال بن کے راہ میں
ہجومِ اشک و آہ میں
جگر کو تھام تھام کر یہ مُسکرا رہا ہے کون
یہ راہ میں گا رہا ہے کون

یہ راگ ہے کہ زندگی کی دُکھ بھری پُکار ہے
خیال چاک چاک ہے، نگاہ تار تار ہے
حیات ہے کہ بار ہے

تڑپ تڑپ کے اہلِ درد کو بُلا رہا ہے کون
یہ رہ میں گا رہا ہے کون

غبارِ مُفلسی میں ولولے ہیں بے نشان سے
چھلک رہا ہے زندگی کا درد تان تان سے
ادائے نیم جان سے
دلوں میں اضطراب کے دیئے جلا رہا ہے کون
یہ رہ میں گا رہا ہے کون

مچل رہی ہے بیکلی کی لہر خاص و عام میں
چھُپے ہوئے ہیں سینکڑوں سوال ہر سلام میں
شراب جیسے جام میں
مسافروں کے راستے میں تلملا رہا ہے کون
یہ رہ میں گا رہا ہے کون

۱۹۴۷ء

غم کو دل میں دبا لیتے تھے، صبر سے پھن سمٹ لیتے تھے
غربت کی محدود پٹاری میں جو پلتا کھا لیتے تھے
صدیوں کے مظلوم دلوں میں شوق کے طوفاں جاگ اُٹھے ہیں
درد کے مدھم مدھم شعلے بن کر موت کا راگ اُٹھے ہیں
آزادی کی دیوی ناہموار اُفق سے جھانک رہی ہے
زیست زمانے کے دامن میں شوخ ستارے ٹانک رہی ہے
آخر آ پہنچے وہ لمحے دہر کو جو مطلوب رہے ہیں
زرداروں کے خام سفینے ساحل ساحل ڈوب رہے ہیں
بیداری کی گود میں سکّوں کی چالیں دم توڑ رہی ہیں
عقل کی بینیں سانپوں کی پھنکاروں سے سر پھوڑ رہی ہیں
وقت کے طوفانی جھٹکوں سے سحر کے حلقے ٹوٹ رہے ہیں
سانپوں کی خونی آنکھوں سے آگ کے شعلے پھوٹ رہے ہیں
چہروں پر وحشت طاری ہے، زخمی نغمے ہانپ رہے ہیں
شعلوں کے سائے میں سپیرے بیٹھے تھر تھر کانپ رہے ہیں

۱۹۴۷ء

مطربہ راگ سُنا

مطربہ راگ سُنا

زندگی خوُن کا بہتا ہوًا دھارا ہی سہی
میری تقدیر میں لاشوں کا نظارا ہی سہی
آرزو ٹوُٹا ہوًا ایک ستارا ہی سہی
بے سہارا ہی سہی
بے سہاروں کو اُٹھا
مطربہ راگ سُنا

مطربہ راگ سُنا

زیست موہوم اُمیدوں کی کہانی ہے تو کیا
درد میں ڈوبی ہوئی میری جوانی ہے تو کیا
بے رُخی دہر کی اِک رسم پُرانی ہے تو کیا
خُون پانی ہے تو کیا
آگ پانی میں لگا
مطربہ راگ سُنا

مطربہ راگ سُنا

یہ زمانے کی کشاکش، یہ سیاست کا جنُوں
یہ درِ ظُلم پہ جُھکتا ہوا دُنیا کا سکُوں
وضعداری پہ یہ ہنستا ہوا انسانوں کا خُوں
یہ توہم، یہ فسُوں
اب کسی طرح مٹا
مطربہ راگ سُنا

چھوڑ اب رسم روایات زمانے کو بدل
یہ نئی بزم ہے تو اپنے فسانے کو بدل
وقت کے مرحلے دیکھ آئنہ خانے کو بدل
اب ترانے کو بدل
اب نئے ساز بجا
مطربہ راگ سنا

سنہ ۱۹۴۸ء

استقبال

خوشی کا وقت ہے دل مائلِ سُرور کرو
فسُردہ چہروں سے گردِ ملال دُور کرو
سنو کہ بادِ بہاری اِدھر سے گزرے گی
ہمارے شہ کی سواری اِدھر سے گزرے گی
بچھاؤ ریشمی قالین رہگذاروں پر
پڑے نہ گرد کہیں اِن حسین کاروں پر
ہجُومِ خلق بڑھے بھی تو دل کشادہ رہیں
سپاہی کھمبوں کی مانند ایستادہ رہیں

حسین پھریرے خراجِ نگاہ لیتے رہیں
بلند نعرے دلوں کو فریب دیتے رہیں
جو پائمالِ ستم ہے وہ پائمال رہے
نہیں یہ وقت شکایات کا خیال رہے
غرض نہیں ہے سفید و سیاہ سے ہم کو
ثبوت دو کہ عقیدت ہے شاہ سے ہم کو
تمام شہر میں جلسے کرو، چراغ جلاؤ
نہیں چراغ میسّر تو دل کے داغ جلاؤ

۱۹۴۸ء

ٹی پارٹی

جمگھٹا ہال میں ہے قوم کے غم خواروں کا
مُسکراتی ہیں مٹھائی کی تہیں میزوں پر
اور لپٹن کی سُہانی خوشبُو
یُوں ہوس خوردہ دماغوں کو سکُوں دیتی ہے
جیسے منزل زدہ رہگیروں کو
لوریاں دے کے سُلاتی ہے ہوا منزل کی
حلقے بن بن کے سگاروں کا دُھواں پھیلتا ہے
جیسے مفلس کے دلِ زار میں دولت کا خیال
لہلہاتا ہی چلا جاتا ہے

جمگھٹا ہال میں ہے قوم کے غم خواروں کا
رُخ پہ آلام کے سائے ہیں نہ افکار کی گرد
دل میں احساس نہ درد
جیسے بیرونِ طربِ خانہ بھی
زندگی غم میں گرفتار نہیں
کوئی بیمار نہیں
بھوک کے شعلوں سے جُھلسے ہوئے جسموں کی پُکار
یہ ہلاکت کے شرار
یونہی لوگوں کی اُڑائی ہوئی افواہیں ہیں

۱۹۴۳ء

رقص

رقص ابھی جاری رہے
رُوحیں تشنہ ہیں ابھی سارے تماشائیوں کی
پاؤں تیزی سے اُٹھیں
حلقے باہنوں کے بنیں
سینے اور اُبھریں، بھنویں اور تنیں
زُلفیں لہراتی رہیں
نظریں کچھ گاتی رہیں
ابھی خوابوں کی حقیقت نہ کھُلے
ابھی ماحول کے بیماروں پر

کیف ساطاری رہے
رقص ابھی جاری رہے

رقص ابھی جاری رہے
زندگانی کے تقاضوں کا کوئی غم نہ کرو
زندگانی بھی تو اِک رقص ہی ہے
رقص انسانوں کا رقص
دل کے ارمانوں کا رقص
جھونپڑے، جنگ کے میدان، محل
چند ایسے ہیں سٹیج
جن پہ موہوم اُمیدوں کا سہارا لے کر
رقص کرتے چلے آتے ہیں ازل سے انساں
اور تماشائی فلک پر بیٹھے
دیکھتے رہتے ہیں خاموشی سے

۱۹۴۹ء

مشاعرہ

یہ کس شان سے ہال میں جلوہ فرما ہیں فن کے پرستار سارے
کہ جیسے ستارے
نکل آئیں خم ٹھونک کر دشتِ گردوں میں شب کو
حسیں ساڑھیاں بھی نگاہوں کو گرما رہی ہیں
گھنی ڈاڑھیاں بھی نظر آ رہی ہیں
شگفتہ نظر بھی ہیں، بدحال بھی ہیں
جواں بخت بھی ہیں، کہن سال بھی ہیں
سکولوں کے لڑکے بھی آئے ہوئے ہیں
کوئی خوش ادا ہے

کوئی خوبرو ہے
غرض دیکھتا ہوں جدھر تو ہی تو ہے

وہ تالی بجی اور اک شاعرِ نوجواں نے
کیا عرض مطلع
غزل! اور اسٹیج پر کوئی پڑھ کر سنائے!!
ہتک یہ سخن پروروں کی
کسی نے حقارت سے کولھے ہلائے
کوئی خواب سے چونک کر چیخا یا
کوئی مسکرایا
کوئی دِق کے بیمار کی طرح کھانسا
کسی نے وہ فقرہ کسا خونِ دل تک نچوڑا
کسی نے گلا پھاڑ کر داد کا دل پہ مارا ہتھوڑا
کسی نے شرارت سے ٹیبل بجائی

غرض بات بگڑی کچھ ایسی کہ صدرِ مکرّم سے بھی بن نہ آئی
دُہائی مذاقِ سُخن کی دُہائی

وہ پھر ہال میں مکّھیاں بھنبھنائیں
تبسّم کی موجیں دلوں سے اُٹھیں اور ہونٹوں تک آئیں
وہ پھر ایک شاعر بچارا
ترنّم کا مارا
سُخن آشنائی کے شعلوں میں گم ہو گیا ہے

وہ اسٹیج پر ایک اُستاد تشریف لائے
سُخن میں مسلّم
خیالات پُختہ، زباں بھی شگفتہ
غزل اپنی مطلع سے مقطع تلک ساری فر فر سُنائی
مگر چھینک تک فن کے شیدائیوں کو نہ آئی

چلو خیر گزری
رہے چُپ یہ کیا کم عنایت ہے اِن کی

وہ اِک شاعرِ خوش ترنّم نے مخصُوص انداز سے مُسکرا کر
غزل اپنی گائی
ملی فن کے شیدائیوں کو خدائی
گھنی ڈاڑھیاں لہلہائیں
حسیں ساڑھیاں مُسکرائیں

جوانوں کے جذبات میں آگ بھڑکی
رگِ ذوق پھڑکی
اُدھر تان ٹوٹی
اِدھر داد کی نہر پھوٹی

مَیں قرباں ذوقِ سُخن پروری کے

بجا ہے اسے جس قدر داد دیجے
اچھوتے خیالوں کی تعریف کیجے
ہر اک شعر کو غم کی تصویر کہیئے
اسے داغ کہیئے
اسے میر کہیئے
یہ فن ہے تو فکرِ رسا بات کیا ہے
اجی بات کیا ہے
اسے پھر بلانا
بڑا خوب رُو ہے
بڑا خوش گلُو ہے

۱۹۴۹ء

فٹ پاتھ

کرو ختم اِن داستانوں کو اب تم
جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے
بجا ہے تمہارا کوئی اب سہارا نہیں ہے
تمہاری جواں لڑکیاں لاپتہ ہیں
تمہارا جواں سال بیٹا بھی مارا گیا ہے
تمہارے غموں سے مگر کوئی دُنیا کو مطلب
یہ رہ رہ کے ناسُور دل کے دِکھاتے ہو کس کو
مدد کے لئے تم بُلاتے ہو کس کو
غموں سے اُبھرنے کی اب کوئی صُورت نہیں ہے

جہاں کو تمہاری ضرورت نہیں ہے
یہ فٹ پاتھ دامن کو پھیلائے کب سے تمہاری ہی رہ تک رہی ہے
اسے آج سے اپنی جاگیر سمجھو
کہ لاوارثوں کا ٹھکانہ یہی ہے
مآلِ غمِ جاوِدانہ یہی ہے
یہاں رات کو آئیں گے اور بھی کتنے بھائی تمہارے
نہ شرماؤ پیارے
یہ کشکول ہے، یہ پھٹا بوریا ہے
کہیں بیٹھ جاؤ، کہیں لیٹ جاؤ
یہاں رہنے والوں کے دل میں سیاہی نہیں ہے
یہ فٹ پاتھ ہے، قصرِ شاہی نہیں ہے

۱۹۴۹ء

یہ شمعیں بجھا دو

یہ شمعیں بجھا دو
جہاں کو نظر آ رہے ہیں
ہمارے گناہوں کے پُر ہول چہرے
مظالم کے باریک پھندے
ہوس کے چمکتے ہوئے تیز ناخن
زمانے کے تیور بدلنے لگے ہیں
دلوں میں ارادے مچلنے لگے ہیں
کہیں زندگی موت کی راہ میں ڈٹ نہ جائے
اندھیرا کہیں چھٹ نہ جائے

اندھیرا کہ جس کے سہارے پہ ہم جی رہے ہیں
زمانے کا خوں پی رہے ہیں
تعصب کے طوفاں کے شانے ہلا کر
روایات کی تند آندھی چلا کر
جہاں کے خیالوں میں نفرت بسا دو
یہ شمعیں بجھا دو
کسی کے بھی دل میں کدورت نہیں ہے
ہمیں زندگی کی ضرورت نہیں ہے

۱۹۴۹ء

جلسے

کل بھی اِک جلسہ ہُوا آج بھی جلسہ ہو گا
اور جلسے میں کریگا کوئی تقریر برائے تقریر
ایک الفاظ کا جال
پیچ در پیچ خیال
پھر وُہی طرزِ بیاں
پھر وُہی درد میں ڈھالے ہوئے مخصوص پیام
پھر وُہی درسِ شکیب
پھر وُہی وعدۂ فردا کا فریب
پھر وُہی جام میں ڈھلتی ہوئی موجِ تسنیم

الغرض کل کی طرح آج بھی اِک مردِ حکیم
گرم لفظوں کے دہکتے ہوئے انگاروں پہ
رنج و آلام کی زنجیریں پگھلتی ہوئی دکھلائے گا
اور ڈِنر کھا کے چلا جائے گا

۱۹۴۹ء

قطعات

ایک مہوش نے خودکشی کر لی
کہہ کے یہ اِک یزیدِ ثانی سے
شرم و عزت کی موت بہتر ہے
بے حیائی کی زندگانی سے

کِس کو معلوم ہے کہ پلتا ہے
کتنے پردوں میں آرزو کا خواب
چیخ کر زیست ہو گئی بے ہوش
جب اُٹھے مسکراہٹوں کے نقاب

غزلیں

خونِ اخلاص کی بُو آتی ہے پیمانے سے
رند گھبرا کے نکل آئے ہیں میخانے سے

تیز ہوتا ہے جنوں اور بھی سمجھانے سے
کیا توقع کرے دُنیا ترے دیوانے سے

اے اُبھرتی ہوئی موجوں سے اُلجھنے والو
ڈُوب مرنا کہیں بہتر ہے پلٹ آنے سے

کیا تری انجمن آرائیاں یاد آئی ہیں
کیوں پلٹ آئے ہیں وحشی ترے ویرانے سے

آرزوؤں کے معمے نہ ہوئے حل باقی
زندگی اور اُلجھتی گئی سلجھانے سے

۱۹۴۵ء

★

ہُوئی کش مکش زندگی کی فسانہ
وہ دل توڑ کر جا رہا ہے زمانہ
اِسی میں ہے پوشیدہ رازِ زمانہ
فسانہ حقیقت، حقیقت فسانہ
نہ اِترا او صیاد کی دوستی پر
اِسی باغ میں تھا ہمارا آشیانہ
اِدھر نام تک مٹ رہا ہے کسی کا
اُدھر بن رہا ہے کسی کا فسانہ
نہ پُوچھو محبّت کی یہ راز باقی
بہت دُور تک ساتھ آیا زمانہ

سنہ ۱۹۴۵ء

★

نذرِ دنیا ہوئے ارمان ہمارے کتنے
دیکھتے دیکھتے ٹوٹے ہیں ستارے کتنے

چل دیئے چھوڑ کے احباب ہمارے کتنے
وقت نے چھین لئے دل کے سہارے کتنے

موجِ وحشت نے سفینے کو ٹھہرنے نہ دیا
ورنہ آئے ہیں مری راہ میں کنارے کتنے

رکھ لیا ہم نے تری مست نگاہی کا بھرم
بیخودی میں بھی ترے کام سنوارے کتنے

جیتنے والے محبّت میں بہت ہوں باقیؔ
دیکھنا یہ ہے کہ اِس کھیل میں ہارے کتنے

۱۹۴۵ء

★

بھٹک نہ جائیں رہِ نو نکالنے والے
قدم قدم پہ ملیں گے سنبھالنے والے
شبِ فراق کا احساس ہی نہ مٹ جائے
شبِ فراق کو ہنس ہنس کے ٹالنے والے
بہارِ بزم میں تحلیل ہو گیا ہوں میں
کہاں ہیں بزم سے مجھ کو نکالنے والے
غمِ حیات کی منزل ارے معاذ اللہ
سنبھل سکے نہ جہاں کو سنبھالنے والے
نہ بھول جائیں کہیں اپنے آپ کو باقیؔ
خوشی کو ٹالیں مصیبت کو ٹالنے والے

سنہ ۱۹۴۵ء

★

وضعداری کیا حقیقت راس آسکتی نہیں
غم وہ شعلہ ہے جسے دُنیا بُجھا سکتی نہیں

وہ سہارا دے رہے ہیں میرے احساسات کو
اب محبت دونو عالم میں سما سکتی نہیں

عقل نے اوہام یُوں رستے میں لا کر رکھ دیئے
زندگی دُنیا کو اِک مرکز پہ لا سکتی نہیں

دل کی آزادی بجا، نظروں کی بیباکی درست
زیست کیوں اِس پر بھی کُھل کر مسکرا سکتی نہیں

کچھ تو ہو باقی جہاں کی چیرہ دستی کا علاج
زندگی اب اور بارِ غم اُٹھا سکتی نہیں

سنہ ۱۹۵۰ء

★

میکشوں میں وہ اضطراب نہیں
کون اے دوست باریاب نہیں

بارِ دنیا نہ اُٹھ سکا تو کیا
زندگی میرا انتخاب نہیں

دل کی تسکیں بھی چاہتا ہوں میں
میرا مقصد فقط جواب نہیں

اک نہ اک چیز کی کمی ہی رہی
کبھی ساغر کبھی شراب نہیں

دل کو کیونکر فریب دیں باقیؔ
غم حقیقت ہے کوئی خواب نہیں

۱۹۴۵ء

★

کوئی مختار اور کوئی مجبور
خوب ہے تیری بزم کا دستور
غم زدوں کی نہ پوچھیے مقدور
موت بھی دور، زندگی بھی دور
ظلمتِ زیست کی بساط ہی کیا
مے کا اِک گھونٹ اور نور ہی نور
کیا بتائیں کہ زندگی کیا ہے
ایک منزل مگر قریب نہ دور
وضعداری بھی سیکھ لے باقی
یہ بھی ہے اِک جہان کا دستور

سنہ ۱۹۳۵ء

★

یہی جہاں تھا، یہی گردشِ جہاں تھی کبھی
وہ مہرباں تھے تو ہر چیز مہرباں تھی کبھی

ترے شگفتہ نقوشِ پا کے طفیل
مری نظر میں ہر اک راہ کہکشاں تھی کبھی

مری نگاہ سے تیرا غرور روشن تھا
تری نگاہ سے دُنیا مری جواں تھی کبھی

براہِ راست نظر تجھ سے بات کرتی تھی
نہ آس پاس تھی دُنیا نہ درمیاں تھی کبھی

کبھی کبھی مجھے باقیؔ خیال آتا ہے
وہاں نہیں ہے مری زندگی جہاں تھی کبھی

۱۹۴۵ء

★

اخلاص کو مجبورِ فغاں دیکھ رہے ہیں
اندازِ جہانِ گزراں دیکھ رہے ہیں

ہم زیست کی راہوں میں دیئے غم کے جلا کر
گزرے ہوئے لمحوں کے نشاں دیکھ رہے ہیں

کیا جراُتِ بیباک ہے، یہ دل، یہ محبت
قطرے میں سمندر کو نہاں دیکھ رہے ہیں

کیا دُور سے اِک ساغرِ گُل رنگ دکھا کر
وہ کششِ بادہ کشاں دیکھ رہے ہیں

حالات نے اِس طرح جکڑ رکھا ہے باقیؔ
جو کچھ بھی دکھاتا ہے جہاں دیکھ رہے ہیں

سنہ ۱۹۴۵ء

★

تبصرہ تھا مرے فسانے پر
تان ٹوٹی شراب خانے پر

جتنی باتیں قفس میں چھڑتی ہیں
ختم ہوتی ہیں آشیانے پر

زندگی بن کے اِک نگاہِ بسیط
جا پڑی تیرے آستانے پر

اے زمانے سے کھیلنے والو
اور الزام اِک زمانے پر

زندگانی کا سب مزہ باقی
منحصر ہے فریب کھانے پر

سنہ ۱۹۴۶ء

★

کہہ رہی ہیں حضور کی باتیں
ختم ہونے پہ ہیں ملاقاتیں
کس کی راتیں، کہاں کی برساتیں
آپ کے ساتھ تھیں وہ سب باتیں
جانے کس ڈھب کی تھیں ملاقاتیں
اور بھی تلخ ہو گئیں راتیں
اور سے اور ہو گئی دُنیا
جب ملیں حُسن و عشق کی گھاتیں
غم زدہ دل کا ہے کام کیا باقی
یا شکایات یا مُناجاتیں

سنہ ۱۹۴۶ء

★

کچھ اِس طرح وہ مری زندگی کے پاس آئے
سنبھل سنبھل کے ٹھکانے مرے حواس آئے

تُو ہی بتا کہ اُسے کس طرح مَیں سمجھاؤں
تری شکایتیں لے کر جو میرے پاس آئے

حیات راس نہ آئی اگرچہ دل میں مرے
بدل بدل کے اُمیدوں کا وہ لباس آئے

کل اُن کی بزم میں گزری ہے تم پہ کیا باقیؔ
کہ شاد گئے اور اُداس اُداس آئے

۱۹۴۶ء

★

سُورج ڈُوب رہا ہے آؤ طوفِ بادہ و جام کریں
تم بھی ذرا زُلفوں کو سنوارو، ہم بھی ذرا آرام کریں
کِس کا وعدہ، کیسی تمنّا، اُٹھ اے دل آرام کریں
اُن کو بات کا پاس نہیں تو ہم کیوں نیند حرام کریں
محفلِ ہستی کے سازوں پر کیوں خاموشی طاری ہے
آؤ کوئی نغمہ چھیڑیں، لاؤ کوئی کام کریں
ایک سے ایک بلا ہے بڑھ کر جس کے بھی نزدیک گئے
کِس کِس سے ہم اُلجھیں باقیؔ کِس کِس کو بدنام کریں

سنہ ۱۹۴۶ء

★

دل دھڑکتا ہے۔ جام خالی ہے
کوئی تو بات ہونے والی ہے

غمِ جاناں ہو یا غمِ دوراں
زیست ہر حال میں سوالی ہے

حادثہ حادثے سے روکا ہے
آرزو آرزو سے ٹالی ہے

ٹوٹ کر دل ہے اِس طرح خاموش
ہم نے گویا مُراد پا لی ہے

کیا زیاں کا گِلہ کریں باقیؔ
کچھ طبیعت ہی لاابالی ہے

سنہ ۱۹۳۶ء

★

جو تمہارے حضور ہوتا ہے
وہ زمانے سے دور ہوتا ہے

اپنی اپنی وفاؤں پر سب کو
تھوڑا تھوڑا غرور ہوتا ہے

بے رخی کا گلہ کریں نہ کریں
دل کو صدمہ ضرور ہوتا ہے

بخش دیجے تو کوئی بات نہیں
آدمی سے قصور ہوتا ہے

مئے الفت کی بات کیا باقیؔ
اور ہی کچھ سرور ہوتا ہے

سنہ ۱۹۴۶ء

★

ہر آہ پر نظر ہے غمِ صبح و شام کی
پہلی سی بات اب نہیں تیرے غلام کی
اُٹھی نہ جب نگاہ کسی تشنہ کام کی
ساقی کو پڑ گئی خُمِ مینا و جام کی
دکھ دو مرے غموں کو بھی دُنیا کے سامنے
کڑیاں ہیں یہ بھی سلسلۂ صبح و شام کی
ہر ایک معرکے میں رہا گرچہ پیش پیش
لیکن کہیں چلی نہ دلِ تیز گام کی
اِن خشک وادیوں سے کوئی آشنا نہ تھا
باقی ہے میرے نام سے شہرت سہام[1] کی

۱۹۴۶ء

[1] میرے آبائی گاؤں کا نام ہے۔

★

میری فغاں کو بابِ اثر کی تلاش ہے
اِس خانماں خراب کو گھر کی تلاش ہے

شبنم! ترے اِن آئنہ خانوں کی خیر ہو
میرے چمن کو برق و شرر کی تلاش ہے

بیٹھا ہوا ہوں غیر کے در پر شکستہ پا
کِس مُنہ سے مَیں کہوں ترے دَر کی تلاش ہے

جس کی ضیا ہو دسترسِ شامِ غم سے دُور
دُنیا کو ایک ایسی سحر کی تلاش ہے

باقی ہے ٹُوٹنے کو اب اُمّید کا طلسم
اِک آخری فریبِ نظر کی تلاش ہے

۱۹۴۶ء

★

دل کی آس مٹائے کون
جلتی شمع بُجھائے کون
اُن کی بات پہ جائے کون
جھُوٹی آس لگائے کون
دو اِک ہوں تو بات کریں
دُنیا کو سمجھائے کون
ہم حق پر ہی سہی لیکن
اُن کی راہ میں آئے کون
وہ داتا تو ہیں باؔقی
پر دامن پھیلائے کون

سنہ ۱۹۴۶ء

★

ٹھہرو ٹھہرو قافلے والو
دل بیٹھا جاتا ہے سنبھالو
اور ستم کہتے ہیں کس کو
تم ہی کہہ دو دیکھنے والو
کچھ دن اور نہ اُن سے اُلجھو
کچھ دن اور قضا کو ٹالو
افسانہ بھی سُنتے جاؤ
دل کی بات بتانے والو
دُنیا دیکھ نہ لے اے باقیؔ
دل میں اُمیدوں کو چُھپا لو

سنہ ۱۹۳۶ء

اب نہیں تاب زخم کھانے کی
کر نہ تکلیف مُسکرانے کی

"ہے خبر گرم اُن کے آنے کی"
کون سُنتا ہے اب زمانے کی

زندگی پھر نہ راہ پر آئی
دیر تھی اِک فریب کھانے کی

سب کی نظروں میں ہم کھٹکنے لگے
یہ سزا ہے مُراد پانے کی

تھا زمانہ بھی مہرباں باقی
جب ضرورت نہ تھی زمانے کی

١٩٤٦ء

★

چل گیا ہے فسوں زمانے کا
اب تکلّف کرو نہ آنے کا
دیکھ کر ہم کو بے نیازِ حیات
حوصلہ بڑھ گیا زمانے کا
وقت ہو تو حضور سُن لیجے
آخری باب ہے فسانے کا
اِک ستارہ بھی آسماں پہ نہیں
کیا کوئی وقت ہے یہ جانے کا
ڈُوبتا جا رہا ہے دل باقیؔ
وقت یہ تھا فریب کھانے کا

۱۹۴۶ء

★

دشتِ جنوں میں غم کا جرس بولنے لگا
احساس تلملا اُٹھا، دل ڈولنے لگا

کہتے ہیں اِس کو پاسِ تعلق، مرے خلاف
بولے وہ کیا کہ سارا جہاں بولنے لگا

اے جذبِ شوق تیرے اسیروں کی خیر ہو
صیّاد جانے کس لئے پر کھولنے لگا

باقی جہاں میں عشق کا دعویٰ ہی عیب ہے
ہر حادثہ نظر میں مجھے تولنے لگا

۱۹۴۷ء

★

اُلٹی بساطِ میکدہ، جامِ ہوس چلے
ساقی کا خُون پی لیں جو رِندوں کا بس چلے
ممکن ہے آ ملے کوئی گم گشتہ راہرو
تھوڑی سی دُور اور صدائے جرس چلے
کیوں چھا رہی ہے بزمِ جہاں پر فسردگی
دو دن تو اور ساعتِ سوزِ نفس چلے
باقی یہ اختلاف یہ نفرت یہ حادثے
ہم تو نہ ہوں جہاں میں جو دُنیا کا بس چلے

۱۹۴۷ء

★

لبوں کو کھول کر یوں رہ گئے ہم
نہ کہنے پر بھی سب کچھ کہہ گئے ہم
کبھی طوفانِ غم سے کش مکش کی
کبھی تنکے کی صورت بہہ گئے ہم
بُرا ہو اے دلِ حساس تیرا
بہت دنیا سے پیچھے رہ گئے ہم
تجھے دیکھا تو غم کی یاد آئی
وہ کیسی چوٹ تھی جو سہہ گئے ہم
جہاں نے غور سے دیکھا ہے باقی
نہ جانے جوش میں کیا کہہ گئے ہم

سنہ ۱۹۴۷ء

★

تمہاری نگاہیں جو پہچانتے ہیں
زمانے کی باتیں وہ کب مانتے ہیں

فریبِ تلاطم نہ دیں ناخدا اب
سفینے کناروں کو پہچانتے ہیں

زمانے کی چالیں زمانہ ہی سمجھے
نہ تم جانتے ہو نہ ہم جانتے ہیں

تعارف کی کوئی ضرورت نہیں ہے
دوانے دوانوں کو پہچانتے ہیں

کرو ضبطِ غم کی نہ تلقین باقی
جو ہم پہ گزرتی ہے ہم جانتے ہیں

سنہ ۱۹۴۷ء

★

جوشِ جنوں میں زیست کے سارے نشاں جلے
منزل جلی، مقام جلے، کارواں جلے

اہلِ ستم پہ اہلِ ستم کا ستم نہ پوچھ
اِک آستاں کے بدلے کئی آستاں جلے

فصلِ بہار میں جو نکالے گئے ندیم
اُن کی بلا سے باغ جلے، باغباں جلے

مجبوریوں کا نام ہی شاید ہے بیکسی
نظروں کے سامنے بھی کئی آشیاں جلے

باقیؔ ستمگروں کی ادائے ستم نہ پوچھ
زنداں وہیں بنائے نشیمن جہاں جلے

۱۹۴۷ء

★

اُٹھ گئے بزم سے میخوار! نہیں کوئی نہیں
ہیں کہیں صبح کے آثار! نہیں کوئی نہیں
ایک بیکس کے تقاضوں کی حقیقت ہی کیا
مَیں محبّت کا طلبگار! نہیں کوئی نہیں
ظُلم، ادبار، ہوس، وہم، عداوت، نفرت
ہیں کوئی جینے کے آثار! نہیں کوئی نہیں
فصلِ گُل آئی کھنکنے لگے ساغر لیکن
مَیں تبسّم کا سزاوار! نہیں کوئی نہیں
دب گئے اُن کی نگاہوں کے اثر سے باقی
کر لیا جُرم کا اقرار! نہیں کوئی نہیں

۱۹۴۷ء

★

کچھ تو ڈوبے دل کو اُبھارو
اے ہستی کے خام سہارو
دنیا والو! اِتنی نفرت!
اِتنی نفرت! دُنیا والو!
میرا مُنہ کیا دیکھ رہے ہو
کوئی بات کرو غم خوارو!
موجیں اور پابندیٔ دریا
ہٹ جاؤ رستے سے کنارو!
کوئی جھٹک دے دامن باقی
اِتنے بھی پاؤں نہ پسارو!

۱۹۴۷ء

★

یاں تک آئے اپنے سہارے
آگے وحشت جس کو پکارے

جس کو اتنا ڈھونڈ رہے ہیں
جانے وہ کس گھاٹ اتارے

تیری آس پہ آرزوؤں نے
ہر رستے میں پاؤں پسارے

ہم نے جب پتوار سنبھالے
اُبھرے طوفانوں سے کنارے

دُنیا کو ہے شغل سے مطلب
تم ہارو یا باقیؔ ہارے

۱۹۴۸ء

★

ترے جہاں کے نظاروں کا ساتھ دے نہ سکا
مَیں کارواں تھا، غباروں کا ساتھ دے نہ سکا

کچھ اس قدر تھا نمایاں خزاں میں رنگِ حیات
مَیں تشنہ کام بہاروں کا ساتھ دے نہ سکا

کہاں تمہاری تمنّا، کہاں سحر کی نمُود
مریضِ ہجر ستاروں کا ساتھ دے نہ سکا

نظر نہ تھی تو نظاروں کی آرزُو تھی، مگر
نظر ملی تو نظاروں کا ساتھ دے نہ سکا

گُلوں کا رنگِ تبسّم بھی تھا گراں باقی
یہی نہیں کہ مَیں خاروں کا ساتھ دے نہ سکا

۱۹۴۷ء

★

تری نظر کے اشاروں کو ساتھ لائے گی
اُمید اپنے سہاروں کو ساتھ لائے گی

وہی نظر مرے رستے میں بن گئی دیوار
گماں تھا جس پہ نظاروں کو ساتھ لائے گی

تری نظر ہی کا اب انتظار لازم ہے
تری نظر ہی بہاروں کو ساتھ لائے گی

بہت نحیف سہی موجِ زندگی پھر بھی
مچل گئی تو کناروں کو ساتھ لائے گی

تُو آنے والے زمانے کا غم نہ کر باقیؔ
کہ رات اپنے ستاروں کو ساتھ لائے گی

۱۹۴۶ء

★

میکدے سے حضور تک پہنچا
میرا قصہ بھی دور تک پہنچا

سرفرازی کی بات ہے ساقی
یوں تو میں بھی حضور تک پہنچا

خلد کا ذکر آ گیا تھا ذرا
شیخ حور و قصور تک پہنچا

صورتِ آئینہ شکست ہوا
عشق بھی جب غرور تک پہنچا

جا سکا غم نہ پھر کہیں باقیؔ
جب دلِ ناصبور تک پہنچا

سنہ ۱۹۴۸ء

★

بیکلی کو قرار مان گئے
لے غمِ زیست ہار مان گئے

آپ کے ساتھ ہی بہار گئی
آپ کا اختیار مان گئے

نہ وہ آئے نہ تو نے چین لیا
اے دلِ بیقرار مان گئے

اُس نے جو کچھ کہا مرے حق میں
لوگ بے اختیار مان گئے

بات دُشوار تھی مگر باقیؔ
مے ملی میگسار مان گئے

۱۹۴۷ء

★

وہ پَو پھٹی، وہ سحر آئی، رات ختم ہوئی
پھر ایک بات چھڑی، ایک بات ختم ہوئی
رہِ حیات کے ہر موڑ پہ یہ غم تو بہ
ابھی حیات، ابھی کائنات ختم ہوئی
مریضِ عشق نے تو شرحِ زندگی کردی
چھڑی تھی آہ سے، ہچکی پہ بات ختم ہوئی
مرے جنوں ہی نے بحثِ حیات چھیڑی تھی
مرے جنوں ہی پہ بحثِ حیات ختم ہوئی
ہمیں نے عشق کیا اختیار جب باقی
جہاں سے رسم و رہِ التفات ختم ہوئی

۱۹۴۷ء

★

دل کے لئے حیات کا پیغام بن گئیں
بیتابیاں سمٹ کے ترا نام بن گئیں

آنے لگا حیات کو انجام کا خیال
جب آرزوئیں پھیل کے اِک دام بن گئیں

کچھ لغزشوں سے کام جہاں کے سنور گئے
کچھ جرأتیں حیات پر الزام بن گئیں

کچھ کم نہیں جہاں سے جہاں کی مسرتیں
جب پاس آئیں دشمنِ آرام بن گئیں

باقی جہاں کرے گا مری میکشی پہ رشک
اُن کی حسیں نگاہیں اگر جام بن گئیں

۱۹۴۶ء

★

بات کو جرم نا سزا سمجھے
اہلِ غم جانے تجھ کو کیا سمجھے
اپنے دعوے کو کیا غلط کہتے
تیری نفرت کو بھی ادا سمجھے
چھوڑیئے بھی اب آئنے کا خیال
دیکھ پائے کوئی تو کیا سمجھے
اِک ستارہ فلک سے ٹوٹا تھا
ہم جسے صُبح کی ضیا سمجھے
اُس کے غم کا علاج کیا باقیؔ
جو محبّت ہی کو دوا سمجھے

۱۹۴۸ء

★

دل ٹھہرتا نہیں ہے سینے میں
جانے کیا مصلحت ہے جینے میں

یہ تمنّا، یہ دل معاذاللہ
آبگینہ ہے آبگینے میں

زخم پر زخم کھائے جاتے ہیں
کِس کا دل ہے ہمارے سینے میں

زندگی نے ہزار حُجّت کی
خُون کا ایک گھُونٹ پینے میں

موجِ طُوفاں کو دیکھ کر باقیؔ
ناخُدا چھُپ گیا سفینے میں

سنہ ۱۹۴۲ء

★

رُک گئی برسات، ساغر تھم گئے
تھا تماشا اے ضبطِ اُلفت ہم گئے

کیا سمجھ سکتے وہ اسرارِ چمن
جو چمن میں صُورتِ شبنم گئے

ایک عالم سرنگوں پایا گیا
جس طرف ہم لے کے تیرا غم گئے

غم کے ہیں یا ضبطِ غم کے ترجماں
اشک جو پلکوں پہ آکر تھم گئے

اُس کے آگے کیا ہُوا باقی نہ پوچھ
بارگاہِ حُسن تک تو ہم گئے

۱۹۴۸ء

★

حُسنِ گُلشن میں فرق کیا آیا
اِک کھِلا پھُول، ایک مُرجھایا

اِس قدر برہمی شکایت پہ
چھوڑیئے ہم نے مُدعا پایا

اور بھی تنگ ہو گئی دُنیا
دل کو دُنیا کا جب خیال آیا

ڈُوب کر دل میں جب نظر نِکلی
ایک عالم کو آشنا پایا

گُمرہی سی ہے گمرہی باقی
جس نے دیکھا اُسی نے سمجھایا

۱۹۴۷ء

★

کچھ اِس انداز سے اُس فتنہ پرور کا پیام آیا
نہ دُنیا میرے کام آئی نہ مَیں دُنیا کے کام آیا
بہارِ میکدہ تقسیم ہونے کو ہوئی لیکن
مرے حصے میں تم آئے نہ مے آئی نہ جام آیا
غمِ ایّام تیری برہمی کا نام ہے شاید
جہاں تیری نظر بدلی وہیں مشکل مقام آیا
زمانہ پس گیا دو حادثوں کے درمیاں آکر
اُدھر اُن کی نظر اُٹھی، اِدھر گردش میں جام آیا
کنارے آلگے کوئی سفینہ جس طرح باقی
اُٹھا اک شور جب محفل میں کوئی تشنہ کام آیا

سنہ ۱۹۴۸ء

★

ہجومِ رنج و الم میں صبر و قرار پر غور کر رہا ہوں
بلا ہے جو اختیار اُس اختیار پہ غور کر رہا ہوں

نظر کے سائے ذرا ہٹا لو کہ عقل کی سانس گھٹ رہی ہے
ہٹو ہٹو میں کشاکشِ روزگار پر غور کر رہا ہوں

بھٹک رہا ہے خیال سود و زیاں کے پُر پیچ راستوں میں
کہاں کی منزل ابھی تو گرد و غبار پہ غور کر رہا ہوں

مَیں کتنا بیباک ہو گیا ہوں مجھے سزا دو چمن پرستو!
بہار کہتے ہو تم جسے اُس بہار پہ غور کر رہا ہوں

بدل رہا ہے کچھ اس طرح اُنکے عہد و پیماں کا رنگ ساقی
کیا تھا کل اعتبار آج اعتبار پہ غور کر رہا ہوں

سنہ ۱۹۴۵ء

★

ہجومِ رنج و غم میں کھو گئے ہم
زمانے کے مقابل ہو گئے ہم
شبِ تاریک کی زد سے نکل کر
سحر کی ظلمتوں میں کھو گئے ہم
چلو اپنوں نے بھی نظریں بدل لیں
وطن میں بھی مسافر ہو گئے ہم
اسی غفلت نے باقیؔ مار ڈالا
کہ جب تقدیر جاگی سو گئے ہم

۱۹۴۹ء

★

جھک گئی آنکھ عرضِ حال کے ساتھ
بات جاتی رہی سوال کے ساتھ

اے غمِ زیست اُس پہ کیا گزری
اک تمنّا بھی تھی خیال کے ساتھ

احتیاطِ غمِ حیات نہ پُوچھ
چل دیئے ہم جہاں کی چال کے ساتھ

ایک الزام بن گئی باقیؔ
فکرِ فردا بھی ذکرِ حال کے ساتھ

۱۹۴۹ء

★

تباہی کے بادل ہیں لہرانے والے
کہاں ہیں زمانے کا غم کھانے والے

غمِ زندگی سے نظر تو ملائیں
غمِ عشق پر ناز فرمانے والے

زمانہ کسی کا ہوا ہے نہ ہوگا
ارے او فریبِ وفا کھانے والے

نظر اک فقیرِ سرِ راہ پر بھی
طوافِ حرم کے لئے جانے والے

چلو جام اک اور پی آئیں باقی
ابھی جاگتے ہوں گے میخانے والے

سنہ ۱۹۴۵ء

★

آپ کی یا جہاں کی بات کریں
کون سے مہرباں کی بات کریں
حُسن خوش ہے نہ عشق آسُودہ
کیا ترے آستاں کی بات کریں
ہو چکیں اُس جہان کی باتیں
اب کوئی اِس جہاں کی بات کریں
زندگی نام ہے بہاروں کا
گُل نہیں گُلستاں کی بات کریں
سب کو ساحل کا پاس ہے باقیؔ
کس سے موجِ رواں کی بات کریں

۱۹۴۹ء

★

اُن کے لبوں پہ آ کے مری بات رہ گئی
انگڑائی لے کے موجِ خرابات رہ گئی
پھر رُخ بدل دیا غمِ ہستی نے دہر کا
پھر زیرِ بحث آ کے تری ذات رہ گئی
ہونے کو اُن سے سینکڑوں باتیں ہوئیں مگر
جس بات کا گلہ تھا وُہی بات رہ گئی
باقیؔ کسی سے اُن کی شکایت نہ کر سکے
کچھ یُوں بدل کے صُورتِ حالات رہ گئی

سنہ ۱۹۴۹ء

★

خیالِ سُود احساسِ زیاں تک ساتھ دیتا ہے
یقیں کتنا ہی پختہ ہو گماں تک ساتھ دیتا ہے

بدلتے جا رہے ہیں دمبدم حالات دُنیا کے
تمہارا غم بھی اب دیکھیں کہاں تک ساتھ دیتا ہے

خیالِ ناخدا پھر بھی مسلط ہے زمانے پر
اگرچہ ناخدا سیلِ رواں تک ساتھ دیتا ہے

زمانے کی حقیقت خود بخود کھُل جائے گی باقیؔ
چلا چل تُو بھی وہ تیرا جہاں تک ساتھ دیتا ہے

۱۹۴۹ء

★

آب مانگو، سراب ملتا ہے
اِس طرح بھی جواب ملتا ہے
سینکڑوں گردشوں کے بعد کہیں
ایک جامِ شراب ملتا ہے
یا مقدّر کہیں نہیں ملتا
یا کہیں محوِ خواب ملتا ہے
جِتنا جِتنا خلوص ہو جس کا
اُتنا اُتنا عذاب ملتا ہے
غم کی بھی کوئی حد نہیں باقی
جب ملے بے حساب ملتا ہے

۱۹۴۹ء

★

ہمہ تن عرضِ حال ہیں ہم لوگ
اِک مجسّم سوال ہیں ہم لوگ

کب کسی پر یہ حادثے گزرے
آپ اپنی مثال ہیں ہم لوگ

چارہ سازوں کے سرد ماتھے پر
عرقِ انفعال ہیں ہم لوگ

وقت کا فیصلہ ہے چارہ گرو
زخم تم ، اندمال ہیں ہم لوگ

کام لیتا ہے اِک جہاں باقی
ہر مصیبت کی ڈھال ہیں ہم لوگ

۱۹۴۵ء

★

علاجِ تلخیٔ ایّام کی ضرورت ہے
فسانے ہو چکے اب کام کی ضرورت ہے

مری حیات بھی صدمے اُٹھا نہیں سکتی
تری نظر کو بھی آرام کی ضرورت ہے

غمِ جہاں کا تصوّر بھی جرم ہے اب تو
غمِ جہاں کو نئے نام کی ضرورت ہے

نظامِ کُہنہ کی باتیں نہ کر کہ اب ساقی
نئی شراب، نئے جام کی ضرورت ہے

ترے لبوں پہ زمانے کی بات ہے باقی
تجھے بھی کیا کسی الزام کی ضرورت ہے

۱۹۴۹ء

★

نہ مے بدلی نہ مے کے جام بدلے
جہاں نے میکدوں کے نام بدلے

وُہی گلشن، وُہی گلشن کے انداز
فقط صیاد بدلے، دام بدلے

جو ہم بدلے تو کوئی بھی نہ بدلا
جو تم بدلے تو صبح و شام بدلے

بدلنے کو ہیں میخواروں کی نظریں
بلا سے رُخ نہ دَورِ جام بدلے

فضائے زیست باقی خاک بدلی
نہ دل بدلا نہ دل کے کام بدلے

۱۹۴۶ء

★

دل کا ہر زخم سی لیا ہم نے
صبر کا جام پی لیا ہم نے
کیسے انسان، کِس کی آزادی
سر پہ الزام ہی لیا ہم نے
لو بدل دو حیات کا نقشہ
اپنی آنکھوں کو سی لیا ہم نے
حادثاتِ جہاں نے راہ نہ دی
آپ کا نام بھی لیا ہم نے
اور کیا چاہتے ہیں وہ باقیؔ
خونِ دل تک تو پی لیا ہم نے

۱۹۴۹ء

★

دیکھ کر تیرے گیسوئے برہم
مُسکرانے لگے حیات کے غم

اِک تمہاری نظر بدلنے سے
ہوگئیں کتنی محفلیں برہم

آ گئے آپ درمیاں ورنہ
کھُل چلی تھی حقیقتِ عالم

دیکھنا تو بہار کے انداز
غنچے غنچے کی آنکھ ہے پُرنم

آ رہی ہے وہ صُبحِ نَو باقی
اُٹھو لے کر حیات کا پرچم

سنہ ۱۹۵۰ء

★

چھا کر دلوں پہ اُن کی نظر مطمئن نہیں
تاروں کو روند کر بھی سحر مطمئن نہیں
ہونٹوں سے آہیں چھیننے والے اِدھر تو دیکھ
ہم چُپ تو ہو گئے ہیں مگر مطمئن نہیں
رُودادِ غم ہے اب نئے عنواں کی فکر میں
آنسو بہا کے دیدۂ تر مطمئن نہیں
غم رفتہ رفتہ بڑھتے گئے زندگی کے ساتھ
دل مطمئن ہُوا تو نظر مطمئن نہیں
روز ایک تازہ حادثہ لائے کہاں سے زیست
مانا کہ دورِ شام و سحر مطمئن نہیں

کِس کاروانِ شوق کا باقی ہے انتظار
کیوں زندگی کی راہگذر مطمئن نہیں

کسی نے نہ دریا کے اسرار کھولے
تلاطم بھی آئے، سفینے بھی ڈولے
زمانے کا ہے کام تقلید کرنا
مرے ساتھ ہولے، ترے ساتھ ہولے
دیا ہے یہ صیّاد نے حکم باقی
قفس ہیں کوئی پَر بھی اپنے نہ تولے

۱۹۵۰ء

★

دیکھ کر صبح کی گھڑی نزدیک
اور بھی رات ہو گئی تاریک

انقلاب چمن معاذ اللہ
پھول کانٹوں سے مانگتے ہیں بھیک

اے شب غم ترا خیال ہے کیا
سن رہے ہیں کہ ہے سحر نزدیک

ساتھ آؤ کہ لوگ کہتے ہیں
راستہ زندگی کا ہے تاریک

دل کا دامن سمیٹ لے باقیؔ
کون دیگا تجھے حیات کی بھیک

سنہ ۱۹۵۰ء

★

تھے ہی کیا اور مرحلے دل کے
ہم بہت خوش ہیں آپ سے مل کے

اور اک دل نواز انگڑائی
راز کھلنے لگے ہیں محفل کے

لاؤ طوفاں میں ڈال دیں کشتی
کون کھائے فریب ساحل کے

رنگ و بُو کے مظاہرے کب تک
پھول تنگ آ گئے ہیں کھل کھل کے

اُڑ رہا ہے غبار سا باقی
چھپ نہ جائیں چراغ منزل کے

سنہ ۱۹۵۰ء

★

آئی نہ پھر نظر کہیں جانے کدھر گئی
اُن تک تو ساتھ گردشِ شام و سحر گئی

کچھ اتنا بے ثبات تھا ہر جلوۂ حیات
لوٹ آئی زخم کھا کے جدھر بھی نظر گئی

نادم ہے اپنے اپنے قرینے پہ ہر نظر
دنیا لہو اُچھال کے کتنی نکھر گئی

آ دیکھ مجھ سے رُوٹھنے والے ترے بغیر
دن بھی گزر گیا، شبِ غم بھی گزر گئی

شبنم ہو، کہکشاں ہو، ستارے ہوں، پھول ہوں
جو شے تمہارے سامنے آئی نکھر گئی

باقی بس ایک دل کے سنبھلنے کی دیر تھی
ہر چیز اپنی اپنی جگہ پہ ٹھہر گئی

ترے حضور ہوں، فکرِ حیات ہے پھر بھی
مرے لبوں پہ زمانے کی بات ہے پھر بھی
اگرچہ اِس میں تری کوششیں بھی شامل ہیں
یہ کائنات مری کائنات ہے پھر بھی
کہاں حقیقتِ جلوہ، کہاں فریبِ شرار
ہزار شمعیں جلیں رات رات ہے پھر بھی

سنہ ۱۹۵۰ء

★

تھا میسّر نہ ایک تار ہمیں
ہنس پڑی دیکھ کر بہار ہمیں

اِتنا خود پر بھی اعتبار نہیں
جتنا تجھ پر ہے اعتبار ہمیں

اب محبت کا یہ تقاضا ہے
کاکلوں کی طرح سنوار ہمیں

تیری نظروں پہ حرف آتا ہے
ورنہ دل پر ہے اختیار ہمیں

وقت نے بارہا دیئے باقیؔ
پھول کے رنگ میں شرار ہمیں

سنہ ١٩٥٠ء

★

ترا غم ہر طرف چھایا ہُوا ہے
یہ کیسا جال پھیلایا ہُوا ہے
خوشی سے دے فریبِ زندگانی
کہ تجھ پر اعتبار آیا ہُوا ہے
ازل سے ہے پریشاں زندگانی
یہ عُقدہ کِس کا اُلجھایا ہُوا ہے
دلوں میں فاصلہ اِتنا نہیں ہے
زمانہ درمیاں آیا ہُوا ہے
بہانے لاکھ ہیں جینے کے باقی
مگر دل ہے کہ گھبرایا ہُوا ہے

سنہ ۱۹۵۰ء

★

تجھ پہ یا خود پہ اعتبار کریں
کونسا رنگ اختیار کریں

تجربے کا یہی تقاضا ہے
آپ پر بھی نہ اعتبار کریں

پُرسشِ غم نہیں ہے غم کا علاج
یہ تکلّف نہ غمگسار کریں

حد نہیں انتظار کی کوئی
آگے ہم کتنا انتظار کریں

پتّا پتّا ہے مضمحل باقیؔ
ہم کہاں تک غمِ بہار کریں

سنہ ۱۹۵۰ء

★

دیکھ کر آ گیا ہے اُن کو خیال
ورنہ کرتا ہے کون پرسشِ حال
آرزوئے سکونِ دل توبہ
آپ کی بزم تک گیا ہے خیال
اِک مصیبت سے بچ گئے تو کیا
دل سلامت رہے ہزار وبال
لازمی ہے سماعتِ احساس
لوگ کرتے ہیں زیرِ لب بھی سوال
ہیں ابھی مرحلے بہت باقی
خود فریبی تو ہے اِک آخری چال

سنہ ۱۹۵۰ء

★

اہلِ دل فرمائیں کیا درکار ہے
جام ہے، مے ہے، رسن ہے، دار ہے

خار کو کوئی کلی کہتا نہیں
نرم ہو، نازک ہو پھر بھی خار ہے

کچھ کہیں تو آپ ہوتے ہیں خفا
چُپ رہیں تو زندگی دُشوار ہے

لوریاں دیتی رہی دُنیا بہت
پھر بھی جو بیدار تھا، بیدار ہے

کاش ہوتے اتنے اچھّے آپ بھی
جتنی اچھّی آپ کی گُفتار ہے

کل کہاں تھی آج ہے باقیؔ کہاں
زندگی کتنی سُبک رفتار ہے

ناز اُٹھاتا پھرے ہے کِس کِس کا
آپ سے کام آ پڑے جس کا
ہم بھی شاکی ہیں، آپ بھی شاکی
اب کرے کون فیصلہ کِس کا
میرے جاتے ہی ہو گیا باقیؔ
اَور سے اَور رنگ مجلس کا

۱۹۵۰ء

★

ہم سُبک سر، وہ سرگراں ٹھہرے
گفتگو دیکھیے کہاں ٹھہرے
زندگی چاہتی ہے ہنگامہ
اور ہم لوگ بے زباں ٹھہرے
آپ کو کارواں سے کیا مطلب
آپ تو میرِ کارواں ٹھہرے
گردشِ دہر ساتھ ساتھ رہی
ہم جدھر بھی گئے، جہاں ٹھہرے
ہر قدم پر تھا اک صنم خانہ
کیا بتائیں کہاں ٹھہرے

کچھ تو کج رَو جہاں بھی ہے باقی
اور کچھ ہم بھی قِصّہ خواں ٹھہرے

اُس طرف بھی ہے اِک جہاں آباد
جس طرف آپ کی نگاہ نہیں

پُرسشِ حالِ غم بھی رہنے دو
اِس تکلّف کی کیا ضرورت ہے

سنہ ۱۹۵۰ء

★

حسین حسین نظر آتے ہیں آرزوؤں کے جال
نئی نئی ہے محبت، جواں جواں ہیں خیال
کبھی پیامِ قضا ہے، کبھی نویدِ حیات
تمام عمر معمہ رہا تمہارا جمال
کیا جو غور محبت کے ماحصل پہ کبھی
تو دھندلے دھندلے نظر آئے حسن کے خد و خال
کس اعتماد پہ دعویٰ کریں محبت کا
بدل بھی جاتے ہیں اے دوست آدمی کے خیال
بس ایک اُن کے اشارے کی دیر ہے باقیؔ
نفس نفس ہے تمنا، نظر نظر ہے سوال

سنہ ۱۹۵۰ء

★

مجھے خراب جنوں کر کے تُو نے کیا پایا
ہزار پھول کھلیں گے جو ایک مُرجھایا

ترے غرور نے محفل میں جو نہ بات سُنی
ترے شعور نے خلوت میں اُس کو دُہرایا

تمہارے ذکر سے دل کو سکوں ملے نہ ملے
چلو کوئی نہ کوئی مشغلہ تو ہاتھ آیا

بہت غرور تھا اپنی وفاؤں پر جس کو
اُسی کو تیری نگاہِ کرم نے ٹھکرایا

کچھ اس طرح بھی ملے ہیں فریبِ غم باقی
قریب پہنچے تو آگے سرک گیا سایا

سنہ ۱۹۵۰ء

★

کس کا احساس اور کیسے گِلے
بات کرنے سے پہلے ہونٹ سِلے
زندگی پھر بھی اک حقیقت ہے
کچھ تمہارا پتہ ملے نہ ملے
گلستاں کی سیاہ بختی دیکھ
تیرے جانے کے بعد پھول کِھلے
کیا اسی کا ہے نام ہمدردی
مِٹ گئے ہم تمہارے لب نہ ہلے
یہ بھی کوئی عجب نہیں باقیؔ
وہ ملیں اور سکونِ دل نہ ملے

سنہ ۱۹۵۰ء

★

کِس طرح کوئی اُن کو سمجھائے
بات چھیڑیں تو بات کھُل جائے

تھام کر دل حیات بیٹھ گئی
وقت نے اِتنے تیر برسائے

گفتگو تلخ ہوتی جاتی ہے
کاش ایسے میں کوئی آ جائے

کِس کے ہاتھوں میں تھا نظامِ چمن
وقت سے پہلے پھُول مُرجھائے

ہوتے رہتے ہیں حادثے باقی
اِس قدر بھی نہ کوئی گھبرائے

سنہ ۱۹۵۰ء

★

دل کو دل کا مُدعا سمجھائیں کیا
جُز غمِ ہستی کوئی غم کھائیں کیا

وضعداری بھی ہے آخر کوئی چیز
پھُول تیرے سامنے مُرجھائیں کیا

کوئی نغمہ اِس طرف آتا نہیں
رنگِ محفل بن کے ہم اُڑ جائیں کیا

بے نیازی سے ہے قائم شانِ حُسن
ہم اُنہیں یاد آئیں پر یاد آئیں کیا

دل کے بُجھنے کا تو باقی غم نہیں
گردشِ دُنیا کو منہ دکھلائیں کیا

سنہ ۱۹۵۰ء

★

موت کا جب تک خیال آتا رہا
حادثے پر حادثہ چھاتا رہا

ہم رہے محرُوم تو کِس کا قصور
وقت اپنا جام چھلکاتا رہا

پُرسشِ احوال گویا جُرم تھا
یُوں وہ شرمایا کہ شرماتا رہا

زیست بھی پھرتی ہے کیا محور کے گرد
جو گیا وہ سامنے آتا رہا

ناخُدا کا آسرا تو دیکھئے
ڈُوبنے کا لُطف بھی جاتا رہا

۱۹۵۱ء

بے کلی بے سبب نہیں ہوتی
اِتنی لمبی تو شب نہیں ہوتی

ہم کہاں تک گِلہ کریں غم کا
آپ سے بھول کب نہیں ہوتی

کھُل کے باتیں کرو کہ اب ہم سے
گفتگو زیرِ لب نہیں ہوتی

دل کی حالت عجیب ہوتی ہے
کوئی اُمید جب نہیں ہوتی

کوئی باقی سُنے سُنے نہ سُنے
داستاں ختم اب نہیں ہوتی

۱۹۵۱ء

★

اپنا قصّہ سُنا رہا ہُوں مَیں
سامنے تیرے آ رہا ہُوں مَیں

ایک مُدّت تری محبّت میں
اپنے دل سے جُدا رہا ہُوں مَیں

تیری شہرت کے واسطے کیا کیا
خود پہ پردے گرا رہا ہُوں مَیں

اِک زمانے کی ہے نظر مجھ پہ
اِس لئے مُسکرا رہا ہُوں مَیں

زندگی دُھن رہی ہے سر باقی
کونسا راگ گا رہا ہُوں مَیں

سنہ ۱۹۵۱ء

★

ہم کس کے جہاں میں بس رہے ہیں
جینے کے لئے ترس رہے ہیں

گلشن میں اُنہیں بھی ہم نہیں یاد
جو ساتھ قفس قفس رہے ہیں

کچھ غرقِ شراب ہو گئے ہیں
کچھ جام کو بھی ترس رہے ہیں

کس رنگ میں زندگی کو ڈھالیں
ہر رنگ میں آپ بس رہے ہیں

آئی ترے قہقہوں کی آواز
یہ پھول کہاں برس رہے ہیں

تخریب کا ماحصل ہے تعمیر
کل اُجڑے تھے آج بس رہے ہیں
شبنم کی طرح اُڑے تھے باقی
بادل کی طرح برس رہے ہیں

۱۹۵۱ء

۷ جُرم کر کے بھی نہیں ہیں مجُرم
اِتنا اندھیر نہیں دیکھا ہے

★

یاد آؤ نہ صُبح و شام بہت
زندگی کو ہیں اور کام بہت

ابھی آزادیٔ حیات کہاں
ابھی پیشِ نظر ہیں دام بہت

ضبطِ غم آخری مقام نہیں
اِس سے آگے بھی ہیں مقام بہت

اے محبت تجھے بھی دیکھ لیا
سُنتے آتے تھے تیرا نام بہت

بند کیجے بیاضِ غم باقیؔ
سُن چکے آپ کا کلام بہت

۱۹۵۱ء

★

ہر بات سے با خبر رہی ہے
جب تک کہ نظر نظر رہی ہے

مت دیکھ کہ ہے کہاں زمانہ
یہ سوچ کہ کیا گزر رہی ہے

یا بات میں بھی اثر نہیں تھا
یا کام نظر بھی کم رہی ہے

دیکھو تو ہے زخم زخم سینہ
کہنے کو کلی نکھر رہی ہے

حالات کا انتظار باقی
وہ زُلف ابھی سنور رہی ہے

۱۹۵۱ء

★

منزل کے رہے نہ رہگذر کے
اللہ رے حادثے سفر کے

وعدہ نہ دلاؤ یاد اُن کا
نادم ہیں ہم اعتبار کر کے

خاموش ہیں یوں اسیر جیسے
جھگڑے تھے تمام بال و پر کے

کیا کم ہے یہ سادگی ہماری
ہم آگئے کام راہبر کے

یوں موت کے منتظر ہیں باقیؔ
مل جائے گا چین جیسے مر کے

۱۹۵۱ء

★

پہچان سکے نہ تیرے ڈھب تک
ہم جانے کہاں رہے ہیں اب تک

کیا کیا تھے اُصول زندگی کے
مشکل نہ پڑی تھی کوئی جب تک

وہ بات بھی رائیگاں گئی ہے
آئی جو بصد حجاب لب تک

آئے نہ خیال میں کسی کے
ہم بیٹھے رہے خموش جب تک

کیوں زیست کے منتظر ہو باقیؔ
آتا نہیں یہ پیام سب تک

سنہ ۱۹۵۱ء

★

چیں بر جبیں ہو کتنے حسیں ہو
اتنی خموشی گویا نہیں ہو
وہ مہرباں ہیں کیونکہ یقیں ہو
دُنیا سے کھیلو ناز آفریں ہو
یہ بے حجابی پردہ نشیں ہو
جیسا سُنا تھا ویسے نہیں ہو
سوچو تو باقیؔ
سب کچھ تمہیں ہو

۱۹۵۱ء

★

غم کا باب وا ہُوا — دل کا حق ادا ہُوا

دل بنا، دوا ہُوا — درد کیا سے کیا ہُوا

تم مٹے کہ ہم مٹے — جو ہُوا بُرا ہُوا

میرا تذکرہ ہی کیا — مَیں تو بیوفا ہُوا

یہ کرم بجا مگر — وہ غرور کیا ہُوا

ہم کہیں بھی کچھ تو کیا — تُو نے جو کہا ہُوا

باقیؔ اُن سے مل کے درد
اور بھی سوا ہُوا

۱۹۵۱ء

★

سامنے بیٹھ کے ہر بات ہوئی
پھر بھی اُن سے نہ ملاقات ہوئی
یُوں تو کیا کچھ نہیں ہوتا لیکن
پُوچھیئے اُس سے جسے مات ہوئی
دل ہی جب ٹُوٹ گیا تو پھر کیا
نہ ہوئی یا بسر اوقات ہوئی
آپ پھر بیچ میں بول اُٹھے ہیں
کب ابھی ختم مری بات ہوئی
میرے ہوتے تو وہ چُپ تھے باقی
کیا مرے بعد کوئی بات ہوئی

سنہ ۱۹۵۱ء

★

ہر گھڑی فکر کہ اب کیا ہوگا
ایسے جینے کا سبب کیا ہوگا

دل جُھکا جاتا ہے سر سے پہلے
اِس سے بڑھ کر بھی ادب کیا ہوگا

وہ نہ آئیں گے سُنا ہے لیکن
یُوں ہُوا بھی تو عجب کیا ہوگا

صُبح میں دیر ہوئی جاتی ہے
کیا کہیں آج کی شب کیا ہوگا

دے گیا مات زمانہ باقیؔ
منفعل ہونے سے اب کیا ہوگا

سنہ ۱۹۵۱ء

★

ظاہر تھا وہ غم تری "نہیں" سے
ہم کچھ بھی نہ کہہ سکے یقیں سے

رُوداد حیات کیا سُنائیں
ہے یاد مگر کہیں کہیں سے

جیسے یہ تری ہی رہگذر ہے
ہم بیٹھ گئے ہیں کس یقیں سے

رستے سے ہے گر پلٹ کے آنا
بہتر ہے پلٹ چلو یہیں سے

جذبات میں بہہ گئے ہیں باقیؔ
واقف تھے نہ ہم دلِ حزیں سے

سنہ ۱۹۵۱ء

★

بات پر اپنی ہم جب آتے ہیں
زندگی کی ہنسی اُڑاتے ہیں

شبِ غم کا کوئی سوال نہیں
نیند آئے تو سو بھی جاتے ہیں

جانتے ہیں مآلِ غم پھر بھی
لوگ کیا کیا فریب کھاتے ہیں

راستہ بھولنا تو ہے اِک بات
راہرو خود کو بھول جاتے ہیں

بات کو سوچتے نہیں باقیؔ
لوگ جب داستاں بناتے ہیں

سنہ ۱۹۵۱ء

★

آپ سے آشنائی کرتے ہیں
بات اپنی پرائی کرتے ہیں
کر رہے ہیں کوئی خطا جیسے
اس طرح ہم بھلائی کرتے ہیں
جن پہ ہوتا ہے اعتبار وہی
وقت پر بے وفائی کرتے ہیں
راہ سے آشنا نہیں پھر بھی
حسرت رہنمائی کرتے ہیں
بھول جاتے ہیں خود کو بھی باقیؔ
لوگ جب ہمنوائی کرتے ہیں

۱۹۵۱ء

★

اشکوں میں خیال ڈھل رہے ہیں
بجھ بجھ کے چراغ جل رہے ہیں
آداب چمن بھی سیکھ لیں گے
زنداں سے ابھی نکل رہے ہیں
پھولوں کو شرار کہنے والو
کانٹوں پہ بھی لوگ چل رہے ہیں
ہے جھوٹ کہ سچ کسے خبر ہے
سنتے ہیں کہ ہم سنبھل رہے ہیں
کہتے ہیں اسے نصیب باقی
پانی سے چراغ جل رہے ہیں

سنہ ۱۹۵۱ء

★

کیا ملے گی ہمیں خبر اپنی
ہے گراں خود پہ اِک نظر اپنی
دوسروں کے بھلے میں بھی اے دوست
فکر ہوتی ہے بیشتر اپنی
اِک سحر ظُلمتِ جہاں سے دُور
کہہ سکیں ہم جسے سحر اپنی
کارواں ہے قریب منزل کے
اب کرے فکر راہبر اپنی
پُوچھتے ہیں جہاں کی ہم باقی
اور کہتا ہے چارہ گر اپنی

۱۹۵۱ء

★

ہم پوُچھ سکے نہ حال تیرا
لے آیا کہاں خیال تیرا

جیسے کسی غنچہ کا تصوّر
یوُں آتا ہے اب خیال تیرا

ہم دیکھتے رہ گئے جہاں کو
پوُچھا تھا کسی نے حال تیرا

ٹوُٹے ہیں تعلّقات کیونکر
میرا تھا نہ یہ خیال تیرا

کِس رنگ میں وہ ملے تھے باقیؔ
دل ہی میں رہا سوال تیرا

۱۹۵۱ء

★

تارِ دل کے ٹوٹ کر چُپ ہو گئے
چُپ نہ ہوتے تھے مگر چُپ ہو گئے

سوچ کر آئے تھے ہم کیا کیا مگر
رنگِ محفل دیکھ کر چُپ ہو گئے

کیا کبھی اِس کا بھی آیا ہے خیال
کیوں ترے شوریدہ سر چُپ ہو گئے

کہہ رہے تھے جانے کیا لوگوں سے وہ
مجھ کو آتا دیکھ کر چُپ ہو گئے

مَیں نہیں گویا کسی کا ترجماں
ہمنوا یُوں وقت پر چُپ ہو گئے

اِک اُداسی بزم پر چھا جائے گی
ہم بھی اے باقیؔ اگر چُپ ہو گئے

۱۹۵۱ء

ذرا مسکراہٹ کا پردہ اُٹھا دے
نمایاں نہیں ہیں خد و خال تیرے

کسی نے تمہیں آج کیا کہہ دیا ہے
نظر آ رہے ہو پرائے پرائے

★

ماضی میں ہیں اب نہ حال میں ہم
رہتے ہیں ترے خیال میں ہم
فردا ہے کوئی خیال جیسے
یوں مست ہیں اپنے حال میں ہم
کھو بیٹھے ہیں اعتبار اپنا
آ آ کے جہاں کی چال میں ہم
آئے نہ اِدھر غمِ زمانہ
بیٹھے ہیں ترے خیال میں ہم
دیتے ہیں کوئی جواب یا قی
کھوئے ہیں ابھی سوال میں ہم

سنہ ۱۹۵۱ء

★

موج ساحل سے جب جُدا ہو جائے
ایک طُوفاں کی ابتدا ہو جائے

لاکھ مجبُوریاں سہی لیکن
آپ چاہیں تو کیا سے کیا ہو جائے

ہم کہیں جو روا نہیں لیکن
تم کہو جو وُہی روا ہو جائے

تیری رحمت پہ اِس قدر ہے یقیں
جب خیال آئے اِک خطا ہو جائے

دل اکیلا چراغ ہے باقی
جب بُجھے روشنی سوا ہو جائے

۱۹۵۱ء

★

ساحل سے نہ کیجئے اشارا
کچھ اور بھی دُور اب خدارا
کھاتے گئے ہم فریب جُوں جُوں
بڑھتا گیا حوصلہ ہمارا
اب کیا ہو کہ لب پہ آگیا ہے
ہرچند یہ راز تھا تمہارا
احساس مِلا ہے سب کو لیکن
چمکا ہے کوئی کوئی ستارا
ہوتی ہے قدم قدم پہ لغزش
ملتا ہے کہیں کہیں سہارا

اِس طرح خموش ہیں وہ جیسے
مَیں نے کِسی اَور کو پُکارا
حالات کی نذر ہو نہ جائے
باقی ہے جو ضبطِ غم کا یارا

سنہ ۱۹۵۱ء

★

ہر نظر ایک گھات ہوتی ہے
دل میں جب کوئی بات ہوتی ہے
شمع بجھتی ہے، زُلف کھُلتی ہے
تب کہیں رات، رات ہوتی ہے
حُسن سرشار، عشق وارفتہ
کِس سے ایسے میں بات ہوتی ہے
زیست لے بیٹھتی ہے اپنے گلے
غم سے جب کچھ نجات ہوتی ہے
بے رُخی، اختلاف، رُوکھا پن
یُوں بھی کیا کوئی بات ہوتی ہے

زخم کھا کر نظر جب اُٹھتی ہے
حاصلِ کائنات ہوتی ہے
غم کا احساس تک نہیں باقی
یوُں بھی غم سے نجات ہوتی ہے

سنہ ۱۹۵۱ء

★

جو دُنیا کے الزام آنے تھے، آئے
بہت غم کے ماروں نے پہلو بچائے
کِسی نے تمہیں آج کیا کہہ دیا ہے
نظر آ رہے ہو پرائے پرائے
بہت واقعے پیش آئے تھے لیکن
نہ تم نے سُنے کچھ نہ ہم نے سُنائے
ملاقات کی کونسی ہے یہ صُورت
نہ ہم مُسکرائے، نہ تم مُسکرائے
فسانہ سُنائے چلا جا رہا ہُوں
یقیں سُننے والوں کو آئے نہ آئے

زمانے کی آنکھوں میں نُور آگیا ہے
کوئی اپنے دامن کے دھبّے چھپائے
نہ دُنیا نے تھاما نہ تُو نے سنبھالا
کہاں آکے میرے قدم ڈگمگائے
اُلجھتے ہیں ہر گام پر خار باقی
کہاں تک کوئی اپنا دامن بچائے

سنہ ۱۹۵۱ء

★

ڈوب کر نبض اُبھر آئی ہے
کیا کوئی اُن کی خبر آئی ہے

غمزدہ غمزدہ، لرزاں لرزاں
لو شبِ غم کی سحر آئی ہے

کیا کوئی اپنا ستم یاد آیا
آنکھ کیوں آپ کی بھر آئی ہے

کیا محبت سے تعلق تجھ کو
یہ بلا بھی مرے سر آئی ہے

آپ کے اُٹھتے ہی ساری دُنیا
لغزشیں کھاتی نظر آئی ہے

زندگی کتنی کٹھن راہوں سے
باتوں باتوں میں گزر آئی ہے
میری قسمت میں نہیں کیا باقی
جو خوشی غیر کے گھر آئی ہے

سنہ ۱۹۵۱ء

★

روٹھ گیا دل سب سے
آپ گئے ہیں جب سے
پہروں سونے والے
جاگ رہے ہیں کب سے
تاریکی ، سناٹا
توبہ ایسی شب سے
کون وفا کا پیکر!
ہم واقف ہیں سب سے
غم ہی غم دیکھا ہے
آنکھ کھلی ہے جب سے

ہم مجرم ہیں لیکن
بات تو کیجے ڈھب سے
کیا لینا، کیا دینا
ہنس کر ملیے سب سے
بات کرو کچھ باقی
چپ بیٹھے ہو کب سے

سنہ ۱۹۵۱ء

★

کب تک راز رہے گا راز
ساری دُنیا ہے غمّاز
کِس کے نغمے، کِس کا ساز
دیکھ زمانے کے انداز
گُونج رہی ہے کانوں میں
ایک سے ایک نئی آواز
دام و قفس تک تیرا زور
گردُوں تک میری پرواز
جب دیکھو برہم برہم
کون اُٹھائے اِتنے ناز

ہمرازوں کے سینوں میں
ڈھونڈ رہا ہُوں اپنا راز
آپ مجسّم مہر و وفا
باقی سب فتنہ پرداز

سنہ ۱۹۵۱ء

اُٹھ گئی ہے وفا ہی دُنیا سے
بات اب آپ پر نہیں آتی

★

خورشید و قمر بھی دیکھ لیں گے
یہ راہگزر بھی دیکھ لیں گے
تاروں کا طلسم ٹوٹنے دو
انوارِ سحر بھی دیکھ لیں گے
جلتا ہُوا آشیاں تو دیکھیں
ٹوٹے ہُوئے پَر بھی دیکھ لیں گے
یہ نیّتِ ناخدا رہی تو
اک روز بھنور بھی دیکھ لیں گے
قانُونِ خُدا بھی ہم نے دیکھا
ترمیمِ بشر بھی دیکھ لیں گے

آغوشِ صدف کھُلی تو باقی
ہم آپ گہر بھی دیکھ لیں گے

۱۹۵۱ء

لوگ دُنیا میں گھُٹ کے مر جاتے
کوئی بندہ اگر خُدا ہوتا

خونِ چکیدہ

اے دوست مرگ و زیست کے مابین تا بہ کے
بیٹھے رہو گے تم حدِ فاصل بنے ہوئے

اتنے گُل بھی نہیں ہیں گلشن میں
جتنے کانٹے چبھو لئے ہم نے

ہواؤں کا رُخ بھی کوئی چیز ہے
سفینہ جدھر بہہ گیا، بہہ گیا

در پہ دستک کسی نے دی باقیؔ
کوئی پُرسانِ حال آ ہی گیا

کیا آپ سے کہہ دیا کسی نے
کس سوچ میں آپ پڑ گئے ہیں

یہ حادثے یہ الم بار ہوتے جاتے ہیں
نقاب اُٹھاؤ بس اب شرحِ کائنات کرو

آج تک بدگماں ہیں وہ ہم سے
آگیا تھا ذرا جہاں کا خیال

عشق اب اپنی حفاظت خود کرے
حُسن اپنے آپ سے بیگانہ ہے

منزلوں کی کمی نہ تھی باقی
زندگانی کہیں تھمی ہوتی

یوں آج خموش ہے زمانہ
جیسے کوئی بات ہو گئی ہے

اپنا اپنا راستہ لیں اہلِ ذوق
شمعِ محفل اور جل سکتی نہیں

پرواز کا وقت آ گیا تھا
ہم دیکھ سکے نہ بال و پر کو

اپنے گھر کی خبر نہیں باقی
وہ ستارہ شناس ہیں ہم لوگ

...nly Title Page Printed at the Raiz Art Press, Rawalpindi

کتاب فرنٹیر ایکسچینج پریس راولپنڈی میں باہتمام حکیم عبدالغنی شایع ہوئی